ڈاکٹر برنارڈ لُویس

انگلستان اور عربی علوم و فنون - ۱

پروفیسر برنارڈ لویس بزرگ مستشرق ہیں۔ وہ کافی عرصہ یونیورسٹی آف لندن میں "مشرقِ وسطیٰ کی تاریخ" کے استاد رہنے کے بعد ریاست ہائے متحدہ امریکہ کی پرنسٹن یونیورسٹی سے منسلک رہے ہیں۔ اُنھوں نے اسلام، اسلامی تاریخ اور اسماعیلی شیعیت کے ساتھ ترکی اور مشرقِ وسطیٰ پر متعدّد کتب اور مقالات لکھے ہیں۔ "کیمبرج ہسٹری آف اسلام" کے مرتّبین میں شامل ہیں، تاہم وہ مستشرقین کے اُس گروہ سے تعلق رکھتے ہیں جو اسلام اور مشرق کے بارے میں وسیع القلبی پیدا نہیں کر سکا۔ ۱۹۴۰ء کے لگ بھگ اُنھوں نے بی - بی - سی (لندن) کے عربی پروگرام میں "انگلستان اور عربی علوم و فنون" کے موضوع پر چھ تقریریں نشر کی تھیں۔ اُسی زمانے میں انگریزی متن British Contributions to Arabic Studies [لندن: لانگ میسز (۱۹۴۱ء)] اور عربی ترجمہ شائع ہو گیا تھا۔ شعبۂ اطلاعات حکومتِ ہند نے اردو ترجمہ جیّد برقی پریس (دہلی) سے شائع کیا تھا جو اب شاذ ہی نظر آتا ہے۔ یہ کمیاب کتابچہ جہاں اس لحاظ سے اہم ہے کہ دوسری عالمی جنگ کے دوران میں برطانوی ذرائع ابلاغ اور اُن کی پالیسیوں کو سمجھنے میں اِس سے مدد ملتی ہے، وہیں اِس سے مؤلف پروفیسر لویس کی علمی دلچسپی کا اظہار ہوتا ہے۔ ۱۹۴۰ء میں اُنھوں نے جس موضوع پر نشری تقاریر لکھیں، وہی ۱۹۸۲ء میں زیادہ تفصیل کے ساتھ اُن کی تالیف The Muslim Discovery of Europe [نیویارک: ڈبلیو - ڈبلیو - نارٹن] میں زیرِ بحث آیا ہے۔

"عالمِ اسلام اور عیسائیت" کی ضخامت اِس بات کی اجازت نہیں دیتی کہ کتابچہ — "انگلستان اور عربی علوم و فنون" — ایک ہی اشاعت میں پیش کر دیا جائے، لہٰذا زیرِ نظر شمارے میں اِس کا ابتدائی نصف حصّہ پیش کیا جاتا ہے۔ مدیر

قرونِ وسطیٰ

ایک مدّت تک محقّقین کا یہ خیال رہا کہ اسلامی اور فرنگی تہذیبیں پہلے پہل ایک دوسرے سے خاص طور پر صلیبی لڑائیوں کے سلسلہ میں روشناس ہوئیں۔ یہ واقعہ ہے کہ یہی پہلا موقع تھا جب عربی مشرق اور عیسائی مغرب میں گہرا تعلق پیدا ہوا اور یقیناً دونوں ایک دوسرے کی تہذیب سے مستفید بھی

ہوئے، مگر زمانہ حال کی تاریخی تحقیقات سے یہ بات ظاہر ہو گئی ہے کہ یہ باہمی استفادہ اثر اور وسعت کے لحاظ سے بہت محدود تھا جیسا کہ اس واقعہ کی نمایاں فوجی نوعیت پر نظر کرتے ہوئے اسے ہونا بھی چاہیے تھا۔ مغرب میں عموماً اور انگلستان میں خصوصاً عربی علوم وافکار کے پہنچنے کا ایک دوسرا ہی ذریعہ تھا۔

شمالی افریقہ کو فتح کرنے کے بعد فاتح عرب نصرت وکامرانی کے پرچم اڑاتے ہوئے یورپ تک نکل آئے اور ایک عرصہ تک ان کی نوآبادیاں بحیرۂ روم کے خطّہ کے دو اہم علاقوں میں قائم رہیں۔ عربوں نے اسپین اور صقلیہ (سسلی) میں ایک ایسی شاندار تہذیب کی بنیاد رکھی جو اس وقت کے تمام عیسائی ممالک کی تہذیب سے کہیں بڑھ چڑھ کر تھی۔ یہ تہذیب اپنی ہم عصر عیسائی تہذیبوں پر اثر انداز ہو کر رہی۔ اس وقت بھی جب کہ یہ علاقے پھر عیسائیوں کے ہاتھ آ گئے، کچھ عرصہ تک وہاں عربی علوم و فنون کا ویسا ہی چرچا رہا۔ عیسائی بادشاہ خود عربی زبان بولتے اور عرب علماء کی امداد کرتے [تھے]۔ ابتدا ہی سے عربوں کی برتر و اعلیٰ تہذیب کے اثرات فرنگی ممالک میں پہنچنے لگے۔ اسپین کے عربی بولنے والے عیسائی اس اثر کو آگے بڑھانے کا اہم ذریعہ ثابت ہوئے اور اسپین اور سِسلی کے عربی بولنے والے یہودیوں نے بھی جن کی زبان ان کے ہم مذہب فرنگیوں کی طرح عبرانی تھی، مغرب میں عربی علوم وفنون کو پھیلانے میں بہت مدد دی۔ ہم اس سلسلہ میں ایک ہسپانوی یہودی فلسفی اور عالم ابراہم بن عزرا کا خاص طور پر ذکر کریں گے۔ یہ شہر طولیدو کا رہنے والا تھا۔ اس نے ۵۹-۱۱۵۸ء میں لندن کا سفر کیا اور کچھ دنوں وہاں تعلیم و تدریس کا کام بھی انجام دیا۔ اسی طرح ایک انگریز ٹامس براؤن (Thomas Brown) کا ذکر بھی کر سکتے ہیں جو سِسلی میں قاضی تھا اور عربی دستاویزات میں اسے "قاضی برون" کے نام سے یاد کیا گیا ہے۔

بارہویں صدی میں شمالی ممالک خصوصاً انگلستان کے علماء طلبِ علم کی غرض سے اسپین کی عرب یونیورسٹیوں میں آنے لگے۔ ان علماء میں پہلا اور بزرگ ترین عالم شہر باتھ (Bath) کا رہنے والا انگریز ایڈیلارڈ (Adelard) تھا۔ یہی شخص تھا جس نے مغرب میں عربی علوم وفنون کے پھیلانے میں پہل کی۔ بارہویں صدی کے ربع اوّل میں ایڈیلارڈ نے عربی زبان اور عربی علوم حاصل کرنے کی غرض سے طول طویل سفر کیے۔ اس نے اپنے ہم عصر عیسائیوں کے لیے بہت سی عربی کتابوں کا لاطینی زبان میں ترجمہ کیا اور واپسی پر انگلستان کے ہونے والے بادشاہ ہنری ثانی کے اتالیق کی حیثیت سے خدمت انجام دی بلکہ اس نے اپنی ایک کتاب بھی شاہ ہنری کے نام معنون کی۔ اس کی اہم ترین تصنیف Natural Questions (مسائل طبیعیہ) ایڈیلارڈ اور اُس کے بھتیجے کے درمیان ایک مکالمہ کی صورت میں ہے۔ بھتیجے نے فرنگیوں کی یونیورسٹیوں میں تعلیم پائی تھی اور ایڈیلارڈ نے عربوں کے یہاں۔ اس مکالمہ کے ذریعہ انھیں دو مختلف اصولوں اور نظریوں میں باہم مقابلہ کیا گیا ہے۔ ایڈیلارڈ اس کتاب کے مقدمہ میں لکھتا ہے کہ "میں عربوں کے نظریہ کی حمایت کروں گا۔ خود اپنی شخصی رائے

پیش نہ کروں گا۔" پھر اُس نے نہایت تفصیل کے ساتھ "عرب طریقہ" کی برتری بیان کی اور اپنے اثر کو کام میں لا کر مغرب میں اسی طریقہ کے پھیلانے میں بہت مدد دی۔ اس نے علم ہیئت اور ریاضی کی بہت سی عربی کتابوں کا ترجمہ کیا اور اس طرح یورپ میں ان علوم کو ترقی دی۔

ایڈیلارڈ کے بعد بہت سے دوسرے انگریز علماء اسپین گئے۔ شہر چسٹر (Chester) کے ایک شخص رابرٹ (Robert) نے بھی بارہویں صدی میں علم ریاضی حاصل کیا اور عربی کتابوں کا ترجمہ کیا۔ ڈینیل آف مورلے (Daniel of Morley) بھی اُس زمانہ کی قابل ذکر شخصیتوں میں سے تھا جیسا کہ وہ خود اپنے متعلق بیان کرتا ہے۔ اسے فرنگی یونیورسٹیاں پسند نہ تھیں اس لیے وہ "دنیا کے زیادہ بالغ نظر حکماء کی تلاش میں" اسپین گیا۔ یہاں سے وہ کتابوں کا ایک ذخیرہ ساتھ لے کر واپس آیا جسے پڑھنے والوں نے ہاتھوں ہاتھ لیا۔ تیرہویں صدی میں میکائیل اسکاٹ (Michael Scot) نے سسلی میں تعلیم پائی اور عربی اور عبرانی زبانوں میں دستگاہ حاصل کی۔ اُس نے ارسطو کی تصنیفات کا عربی سے ترجمہ کیا اور اس طرح ان میں سے بہت سی کتابوں سے مغرب پہلے پہل روشناس ہوا۔ اُس نے ارسطو کی تصنیفات کی عربی شرحوں کا بھی ترجمہ کیا اور خود علم ہیئت اور علم کیمیا پر بہت سی کتابیں تصنیف کیں۔

ان علماء اور ان کے علاوہ ان دوسرے حوصلہ مند انگریزوں کی تصنیفات کا جنھوں نے تحصیل علم کی خاطر مصائب برداشت کر کے عربی ممالک کا سفر اختیار کیا، تہذیب پر بہت اثر پڑا۔ یہ انھیں کی کوششوں کا نتیجہ ہے کہ انگلستان ہی نہیں بلکہ سارا مغرب علوم و فنون کے ان کارناموں سے واقف ہوا جو عربوں نے انجام دیے۔ یہ ایک اہم قدم تھا جس نے یورپ کی تہذیب کو آگے بڑھایا۔ ان تراجم اور تصانیف کا بہت زیادہ اثر ہوا۔ عربی علوم سے جو لوگ بہت زیادہ متاثر ہوئے، ان میں انگلستان کے بلند پایہ فلسفی راجر بیکن (Roger Bacon) اور مشہور شعراء چاسر (Chaucer) اور لڈگیٹ (Lydgate) بھی تھے۔ یہ بات قابل ذکر ہے کہ (Dicts And Sayings of the Philosophers) جو اس سلسلے میں انگلستان میں شائع ہونے والی پہلی کتاب ہے اور ۱۴۷۷ء میں طبع ہوئی تھی، ایک عربی تالیف "کتاب مختار الحکم و محاسن الکلم" سے ماخوذ تھی جسے مصر کے امیر مبشر بن خاتک نے ۱۰۵۳ء میں تالیف کیا تھا۔ یہ عربی کتاب ہنوز غیر مطبوعہ ہے مگر اس کا قلمی نسخہ ہالینڈ میں موجود ہے۔ یہ کتاب فلسفیانہ اقوال و امثال پر مشتمل ہے اور ایک زمانہ میں مشرق میں بہت مقبول تھی۔ اس کا ترجمہ یورپ کی بہت سی زبانوں میں ہوا۔

قرون وسطیٰ کے یورپ پر عرب ہم عصروں اور ان کے مغربی ترجمانوں کا دوگونہ احسان ہے۔ پہلا احسان تو یہ کہ یورپ کو یونانی علوم و افکار کے اس گراں مایہ ترکہ کا بڑا حصہ عربوں ہی کے ہاتھوں پہنچا جسے مغرب تو گنوا چکا تھا مگر عربوں نے محفوظ رکھا اور بڑھایا۔ دوسرا احسان یہ ہے کہ یورپ نے عربوں سے تحقیق کا ایک نیا طریقہ سیکھا جس نے عقل (Reason) کو سند (Authority) پر ترجیح دے کر

آزادانہ تحقیق و تجربہ کی اہمیت پر زور دیا۔ یہی وہ دو سبق تھے جنھیں سیکھ لینے کی وجہ سے بہت بڑی حد تک قرونِ وسطیٰ کے دور کا خاتمہ ہو گیا اور دورِ احیاءِ علوم (Renaissance) کا آغاز ہوا اور جدید یورپ عالمِ وجود میں آیا۔ انگریز علماء نے ان سبقوں کو دوسروں تک پہنچانے کے سلسلے میں اہم خدمات انجام دیں۔ یہ ایک تاریخی حادثہ ہے کہ ٹھیک اس زمانہ میں عربوں نے وہ باتیں جو انھوں نے یورپ کو سکھائی تھیں، خود بھلانی شروع کر دیں اور کئی صدیوں بعد انھیں پھر سیکھنی پڑیں۔

آئیے اس تقریر کے خاتمہ پر شہر باتھ کے ایڈیلارڈ سے سنیں کہ وہ اپنے بھتیجے سے اس نئے طریق کے متعلق جو اس نے اسپین میں سیکھا تھا، کیا کہتا ہے۔ یہ واضح رہے کہ یہ تحریر آٹھ سو برس پرانی ہے۔

> "میں نے عقل کو اپنا رہبر بنا کر اپنے عرب اُستادوں سے کچھ اور سیکھا ہے مگر تمھیں کچھ اور سکھایا گیا ہے۔ تمھاری آنکھیں سند کی ظاہری عظمت سے خیرہ ہو جاتی ہیں اور تم اپنے منہ پر دہانہ چڑھا لیتے ہو۔ آخر سند کو دہانہ نہ کہیں تو اور کیا کہیں؟ جس طرح وحشی درندوں کے منہ پر دہانہ چڑھا کر جہاں چاہتے ہیں، لے جاتے ہیں اور وہ یہ بھی نہیں جانتے کہ اُنھیں کہاں اور کیوں لے جایا جا رہا ہے کیونکہ وہ تو اپنی اُس ڈوری سے جس میں وہ بندھے ہوتے ہیں، کھچے چلے جاتے ہیں۔ ٹھیک اُسی طرح تم میں سے بہت سے ضعیف الاعتقاد لوگ اپنے بھولے پن اور اندھی تقلید کی وجہ سے مصنفین کی سند سے مرعوب ہو کر ٹھوکریں کھاتے ہیں --- افراد کو اسی لیے تو عقل عطا کی گئی ہے کہ وہ اسے حکم قرار دے کر حق و باطل میں امتیاز کر سکیں --- ہمیں سب سے پہلے عقل و خرد کی تلاش کرنی چاہیے اور جس وقت وہ دستیاب ہو جائے (صرف اسی وقت اس سے پہلے نہیں) اس کی تائید میں اگر مل جائے تو سند بھی قبول کر لینی چاہیے۔ سند بذات خود فلسفی کے اعتماد کے لیے کافی نہیں اور نہ اسے اس غرض سے استعمال کرنا چاہیے۔"

جو لوگ عربوں کی تحریروں سے واقف ہیں اور ایڈیلارڈ کے اس سبق کے ماخذوں کو اور جو لوگ مغربی علوم کا کچھ علم رکھتے ہیں وہ اس کی اہمیت کو فوراً تاڑ لیں گے۔

استشراق کی ابتداء

پہلی تقریر میں آپ نے دیکھا ہو گا کہ کس طرح قرونِ وسطیٰ میں انگریز علماء عربوں سے علم حاصل کرنے اسپین اور سسلی گئے اور کس طرح انھوں نے اپنے حاصل کردہ علم کو انگلستان واپس آ کر پھیلایا۔ اب ہم ایک نئی ترقی کا ذکر کرتے ہیں جو تحصیلِ علومِ عربیہ کے سلسلے میں رونما ہوئی یعنی اُن علماء کا ظہور

جنھیں حال کی اصطلاح کے مطابق اوّلین مستشرقین کہا جا سکتا ہے۔ جس دور کا ہم نے پچھلی صحبت میں مطالعہ کیا ہے اور جس دور سے اس وقت بحث ہے ان دونوں کے درمیان جو عرصہ گزرا، اس میں بہت سے تغیرات پیش آئے۔ اس عرصہ میں یورپ نے تو علوم و فنون میں بہت ترقی کر لی مگر عرب اپنا پچھلا تفوق بھی کھو بیٹھے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اب یورپ کے طلباء کو اس کی ضرورت نہ رہی کہ وہ عربی علوم و فنون کی تحصیل کے لیے عرب اساتذہ کی جستجو کریں۔ اس طرح استشراق کی ایک نئی قسم ظاہر ہوئی جس نے علومِ مشرقیہ کی جدید تحقیقات کا دروازہ کھولا۔ آج انگریز طلبہ اس غرض سے عربی نہیں پڑھتے کہ وہ عربی علماء سے علوم و فلسفہ میں سبق لیں بلکہ محض عربی زبان حاصل کرنے کی غرض سے پڑھتے ہیں۔ چنانچہ اب انگریزوں نے پہلے پہل سنجیدگی کے ساتھ عربی زبان و ادب کا مطالعہ شروع کیا۔ انھوں نے اس سلسلہ میں جو خدمات انجام دیں وہ عربوں اور فرنگیوں دونوں کے لیے اسی طرح سودمند ثابت ہوئیں جس طرح حال کے مستشرقین کی خدمات۔ عربی لُغات اور کتب صرف و نحو تالیف کی گئیں۔ عربی کتابوں کے قلمی نسخے مشرق میں طبع ہونے سے بہت پہلے آراستہ و پیراستہ کر کے طبع کیے گئے۔ عرب کی تاریخ اور عربی ادب کے متعلق تحقیقات کا سلسلہ شروع ہوا اور اسی طرح کے دوسرے کام انجام دیے گئے۔ یہ تحریک سترہویں صدی عیسوی سے شروع ہوئی۔ اسی صدی میں انگلستان کی دو بڑی یونیورسٹیوں یعنی کیمبرج اور آکسفورڈ میں عربی پڑھانے کا خاص انتظام کیا گیا اور اس غرض سے انگریز پروفیسر مقرر ہوئے کہ وہ شوقین طلبہ کو عربی زبان سکھائیں۔ اُس زمانہ میں پہلے پہل انگلستان میں عربی کتابیں طبع ہوئیں۔ ہم اس موقع پر اُن شخصیتوں کا ذرا زیادہ تفصیل سے ذکر کریں گے جنھوں نے سب سے پہلے اس کام میں حصہ لیا۔

وہ شخص جسے عام طور پر انگلستان میں "تحصیل علوم مشرقیہ کا باوا آدم" مانا جاتا ہے، ولیم بڈویل (William Bedwell) تھا۔ یہ ۱۵۶۱ء سے ۱۶۳۲ء تک زندہ رہا۔ اس کا ایک دلچسپ مقالہ آج بھی موجود ہے جس میں اس نے عربی زبان کی اہمیت اور اُس کے حاصل کرنے کی ضرورت پر زور دیا ہے۔ اس نے عربی زبان کے متعلق لکھا ہے۔ "یہی ایک زبان ہے جسے دینی تقدّس حاصل ہے اور جو جزائر کینیری (الجزائر السعیدہ) سے ملک چین تک سیاسی معاملات اور کاروبار کی خاص زبان سمجھی جاتی ہے۔" بڈویل کو اپنے زمانے میں کافی شہرت حاصل تھی اور وہ تمام یورپ میں علومِ عربیہ کے ماہر کی حیثیت سے مشہور تھا۔ اس کی خاص تالیف ایک ضخیم عربی لغت ہے جو سات جلدوں میں ہے اور بدقسمتی سے ابھی تک شائع نہیں ہوئی۔ اس کی مطبوعہ کتابوں میں بعض عربی نسخے ہیں جو لندن میں طبع ہوئے اور بعض علومِ قرآنی کے متعلق تحقیقی رسالے ہیں۔ اس نے ان عربی الفاظ کی ایک لغت بھی تیار کی جو بیزنطینی زمانہ سے خود اس کے زمانے تک مغربی زبانوں میں مستعمل چلے آ رہے تھے۔

اُس زمانے کی ایک اور نمایاں شخصیت ایڈمنڈ کیسٹل (Edmund Castell) ہے جو کیمبرج

یونیورسٹی کے اولین عربی اساتذہ میں سے تھا اور ۱۶۰۶ء سے ۱۶۸۵ء تک زندہ رہا۔ اس کی زندگی کا اہم ترین کارنامہ سامی زبانوں کی ایک مشترکہ لغت ہے جس کی تالیف میں اس نے اپنی زندگی کے اٹھارہ سال صرف کیے۔ یہ لغت پہلے پہل ۱۶۶۹ء میں شائع ہوئی۔ مؤلف نے اس لغت کے دیباچہ میں خود اپنے متعلق لکھا ہے۔ "کم از کم ۱۶ یا ۱۸ گھنٹے روزانہ کام کر کے اور جسمانی تکالیف اور مالی نقصانات اٹھا کر کوئی اٹھارہ سال کی شبانہ روز محنت کے بعد" اس نے یہ لغت تالیف کی۔ یہ لغت جو اپنی نوعیت کی پہلی لغت تھی، بہت اہمیت رکھتی تھی اور انگلستان اور یورپ میں متعدد بار طبع ہوئی۔ اس کے علاوہ کیسٹل کی دوسری کتابوں میں تحصیل علوم عربیہ کی قدر و قیمت کے متعلق ایک رسالہ، ابن سینا کی شرح اور عربی طبع زاد نظموں کا ایک مجموعہ ہے جو انگلستان کے شاہ چارلس ثانی کے نام معنون ہے۔

جان گریوز (John Greaves) جو ۱۶۰۲ء سے ۱۶۵۲ء تک زندہ رہا، ایک مشہور ریاضی دان تھا اور ایک زمانے میں آکسفورڈ میں علم ہیئت کا پروفیسر تھا۔ اس نے مشرق قریب اور خاص کر مصر کی کافی سیاحت کی تھی اور عربی اور فارسی زبانوں کا بہت گہرا مطالعہ کیا تھا۔ اس نے عربی اور فارسی کی بہت سی قلمی کتابوں، سکّوں اور جواہرات کا ایک بڑا ذخیرہ فراہم کیا اور فارسی صرف و نحو پر ایک مختصر سی کتاب شائع کی۔ اسے فنِ ریاضی کے متعلق مسلمانوں کی تصنیفات سے خاص دلچسپی تھی اور اس نے اس موضوع پر بہت سے پرانے نسخے اور تحقیقی رسالے شائع کیے۔ اس کا بھائی ٹامس گریوز (Thomas Greaves) بھی عربی و فارسی جانتا تھا۔ اس نے بھی چند مضامین شائع کیے۔ سترہویں صدی میں علومِ عربیہ کے ماہرین کی فہرست میں حسبِ ذیل علماء کا نام لیا جا سکتا ہے۔

ابراہیم وہیلاک (Abraham Wheelock) کیمبرج یونیورسٹی میں عربی کا پہلا پروفیسر تھا۔ سیموئیل کلارک (Samual Clarke) جس نے عربی عروض پر ایک مقالہ لکھا اور مشہور مقامات کے عربی ناموں کی ایک لغت تالیف کی۔ برائن والٹن (Brian Walton) جس نے بہت سی مشرقی زبانوں میں توریت شائع کی۔ ڈوڈلی لوفٹس (Dudley Loftus) جو آئرستانی عالم اور مقنّن تھا۔ جان سلڈن (John Selden) جو ۱۵۸۴ء سے ۱۶۵۴ء تک زندہ رہا۔ اس نے ایک مقنّن اور مدبر کی حیثیت سے اس دور کے انگلستان کی زندگی میں بہت اہم اور نمایاں حصہ لیا۔ جان سلڈن دوسرے علوم کے علاوہ عربی اور دوسری بہت سی مشرقی زبانوں سے واقف تھا۔ اُس نے عربی کی ایک تاریخی کتاب کے نسخے کو مرتّب کر کے ترجمہ کے ساتھ شائع کیا اور مرنے کے وقت مشرقی زبانوں کی کتابوں کے قلمی نسخوں کا ایک بڑا ذخیرہ چھوڑا۔

علومِ عربیہ کے جو ماہرین سترہویں صدی میں گزرے ہیں، اُن میں سب سے بلند مرتبہ شخص ایڈورڈ پوکاک (Edward Pococke) تھا جو ۱۶۰۴ء سے ۱۶۹۱ء تک زندہ رہا۔ یہ پہلا شخص تھا جسے آکسفورڈ میں عربی کا پروفیسر مقرر کیا گیا۔ یہی یورپ کا وہ پہلا مستشرق ہے جس نے حقیقتاً نہایت اعلیٰ

درجہ کی خدمات انجام دیں۔ پوکاک نے بچپن ہی میں عربی پڑھنا شروع کر دی تھی۔ اسے ولیم بڈویل جیسے شخص کی شاگردی کا فخر حاصل تھا۔ اُس نے کچھ دنوں آکسفورڈ میں میتھو پیسر Mathew Pasor سے بھی تعلیم حاصل کی جو مظالم سے تنگ آکر جرمنی سے بھاگ آیا تھا۔ ۱۶۳۰ء میں وہ حلب گیا اور وہاں پانچ برس رہا۔ اس عرصہ میں اُس نے عربی تحریر اور روزمرّہ میں کافی مہارت حاصل کرلی۔ وہ عربی کتابوں کے قلمی نسخوں کا ایک اچھا خاصا ذخیرہ اپنے ساتھ آکسفورڈ لایا اور اس طرح ان نسخوں کو تلف ہونے سے بچایا۔ اس نے حلب کے بہت سے لوگوں سے دوستی پیدا کرلی تھی جن میں خاص کر ایک شیخ فتح اللہ نامی عالم و فاضل تھا جس نے اسے عربی پڑھائی تھی۔ شیخ فتح اللہ کے ساتھ تمام عمر اس کے دوستانہ تعلقات رہے۔

۱۶۳۶ء میں انگلستان واپس آنے کے بعد پوکاک کو آکسفورڈ یونیورسٹی میں عربی پروفیسر کی نئی جگہ پر مقرّر کر دیا گیا جہاں وہ عربی ادب اور صرف و نحو کی تعلیم دیتا رہا۔ بیان کیا جاتا ہے کہ اس کی تقریروں کو سننے کے لیے تمام طلبہ کو شرکت پر مجبور کیا گیا۔ نئے پروفیسر نے ابتدائی تقریر میں عربی زبان اور ادب کی اہمیت پر بحث کی اور اس کے بعد حضرت علی کرم اللہ وجہ کے اقوال پر تقریروں کا ایک سلسلہ شروع کیا۔

۱۶۳۷ء میں اُس نے دوبارہ مشرق کا سفر کیا تاکہ نئی معلومات اور کچھ اور قلمی نسخے حاصل کرے۔ اس نے اپنے پُرانے دوست فتح اللہ سے ایک بار پھر ملاقات کی۔ وہ ۱۶۴۱ء میں آکسفورڈ واپس آیا اور باقی عمر انگلستان ہی میں علمی کاموں میں صرف کر دی اور دوسرے سفر میں مشہور ریاضی دان جان گریوز John Greaves بھی اس کا ہم سفر تھا۔

اس طویل مدّت میں جو اُس نے آکسفورڈ میں گزاری جہاں انجیر کے مشہور درخت کے نیچے بیٹھ کر جسے وہ ملک شام سے لایا تھا اور جو اب بھی موجود ہے اور غالباً انگلستان میں سب سے پُرانا انجیر کا درخت ہے، پوکاک نے بہت قابلِ ذکر کتابیں لکھیں جن میں سے چند کے نام ذیل میں دیے جاتے ہیں۔

۱۔ "عربوں کی تاریخ کا نمونہ" جو ابوالفرج کی تاریخ کا خلاصہ ہے۔ اس کے آخر میں عربی تاریخ، علوم و فنون، ادب اور مذہب پر مختلف حیثیتوں سے نہایت تحقیق کے ساتھ سیر حاصل بحث کی گئی ہے۔ یہ کتاب مستشرقین کی ادبیات میں بہت اہمیت رکھتی ہے اور ایک زمانے تک اس کی بلند پایہ حیثیت کو عام طور پر تسلیم بھی کیا گیا۔ یہ آکسفورڈ میں پہلے پہل ۱۶۴۹ء میں اور پھر ۱۸۰۶ء میں طبع ہوئی۔

۲۔ لامیتہ العجم، یہ طغرائی کی مشہور عربی نظم ہے جسے ترجمہ، نقد و تبصرہ اور مفصّل تشریحات کے ساتھ شائع کیا گیا۔ یہ ۱۶۶۱ء میں آکسفورڈ میں طبع ہوئی۔

۳۔ المختصر فی الدول، ابوالفرج کی تاریخ کا عربی متن ترجمہ کے ساتھ

پوکاک کی علمی زندگی اور اُس کے کارناموں نے یورپ میں علوم مشرقیہ کی تحقیقات کا نیا باب کھولا۔ اپنے زمانہ ہی میں اسے کافی شہرت حاصل تھی اور بعد کے مغربی علماء توسب کے سب اس کے مرہون احسان ہیں۔ یورپ کے گوشہ گوشہ سے اہل علم اس سے امداد و مشورہ طلب کرتے تھے اور بہت سے ملکوں حتیٰ کہ رومانیہ تک کے طلبہ یورپ کے اس مسلم الثبوت استاد سے عربی پڑھنے آکسفورڈ آیا کرتے تھے۔ یورپ میں علومِ عربیہ کا دوسرا قریب قریب اسی پایہ کا ماہر ایک ڈچ تھا جس کا نام گولیس (Golius) تھا اور جولیڈن (Leyden) یونیورسٹی میں عربی کا پروفیسر تھا۔ پوکاک کے متعلق اس کا بیان ہے کہ جہاں تک علومِ مشرقیہ کا تعلق ہے، پوکاک کے پایہ کا دوسرا عالم نہیں۔ ان کتابوں کے علاوہ جن کے نام اوپر دیے گئے ہیں، اُس نے بہت سے تحقیقی رسالے اور قلمی نسخے چھوڑے جو اس کے مرنے کے بعد آکسفورڈ کی باڈلین (Bodleian) لائبریری نے حاصل کر لیے اور آج تک موجود ہیں۔ یہ اس کتب خانہ کے شعبۂ عربی کا قابل قدر جزو ہے۔

اس نے اپنے بعد چھ لڑکے چھوڑے جن میں سے سب سے بڑے لڑکے کا نام بھی ایڈورڈ پوکاک تھا یہ ۱۶۴۸ء سے ۱۷۲۷ء تک زندہ رہا اور اپنے باپ کے نقش قدم پر چل کر تحصیلِ علوم مشرقیہ میں مصروف رہا۔ اس کی شائع شدہ کتابوں میں عبداللطیف کی "تاریخ مصر" کا ناتمام نسخہ اور اس کا ترجمہ اور ابنِ طفیل کی ایک مشہور فلسفیانہ تالیف کا ترجمہ ہے۔

اسی طرح سترہویں صدی عیسوی میں انگلستان میں تحصیلِ علوم عربیہ کے سلسلے میں بہت نمایاں ترقی ہوئی۔ علومِ مشرقیہ کے اس تازہ ذوق و شوق کے کئی اسباب ہو سکتے ہیں۔ اس میں شک نہیں کہ مذہبی سبب بھی ایک اہم سبب تھا۔ اس زمانہ میں یہ احساس پیدا ہو چکا تھا کہ عربی اور عبرانی میں بہت قریبی تعلق ہے، اس لیے یہ توقع تھی کہ عربی زبان حاصل کر لینے سے عہد نامۂ قدیم (توریت) کے متعلق مزید تحقیقات میں مدد ملے گی۔ اس سے بھی زیادہ اہم سبب عربی زبان اور عربی تاریخ کی عام تمدنی اہمیت کا روز افزوں احساس تھا۔ ایک صدی پہلے یورپ میں احیائے علوم کا وسیع معنوں میں دور دورہ تھا۔ اس سلسلے میں قدیم زبانوں اور ان کے متعلق تحقیقات سے نئی دلچسپی پیدا ہوئی۔ یہ ایک فطری امر تھا کہ بنی نوع انسان کی تاریخ اور تمدّن کا مطالعہ کرنے والوں کو عربی دنیا کی اس غیر معمولی اہمیت و حیثیت کا احساس ہوا جو اسے تاریخ انسانی میں حاصل ہے اور انھوں نے اس تاریخی ذخیرے سے اپنی معلومات میں اضافہ کرنے کی کوشش کی۔ بڈویل (Bedwell)، کیسٹل (Castell) اور پوکاک (Pococke) ان سب نے عربی زبان کی عام اہمیت پر مضامین لکھے جن میں یہ بتایا کہ محققین کے لیے اس زبان کا حاصل کرنا کس قدر ضروری ہے۔

آخر میں ہمیں ان تجارتی اور سیاسی تعلقات کا جو انگلستان اور مشرقِ قریب کے درمیان از سر نو قائم

ہوئے اور ان نئے مفادات اور مواقع کا جو اس طرح پیدا ہوئے ذکر کرنا چاہیے۔ یہی اسباب تو تھے جن کی وجہ سے پوکاک دو مرتبہ مشرق کے پُر نتائج سفر کامیابی کے ساتھ انجام دے سکا۔ علوم مشرقیہ سے یہ نئی دلچسپی عام اور ہمہ گیر تھی۔ آرچ بشپ لاڈ (Archbishop Laud) جیسی بلند مرتبہ شخصیت نے بھی انگلستان میں تحصیلِ علوم عربیہ کی توسیع و ترقی میں بہت کوشش کی اور آکسفورڈ میں عربی تعلیمات کی پہلی کرسی قائم کرنے کے لیے مالی امداد بھی دی۔

اس طرح سترہویں صدی میں اس انتشار کے باوجود جو خانہ جنگی کی وجہ سے پیدا ہو گیا تھا نمایاں علمی کارنامے انجام پائے۔ آکسفورڈ اور کیمبرج میں تحصیلِ علوم عربیہ کے مرکز قائم کیے گئے۔ بہت سی کتابیں شائع ہوئیں اور ایک نیا علم پیدا ہوا جس کے جاننے والے بہت سے نامور علماء نے جو بعد کی صدی میں ظاہر ہوئے، عربوں اور یورپ دونوں کے تمدنی ترکہ کو اپنی تحقیقات سے مالامال کر دیا۔ ان کے متعلق ہم اگلی تقریر میں بحث کریں گے۔

اٹھارہویں صدی

انگلستان میں مشرقی علوم کا جو بیج سترہویں صدی میں بویا گیا تھا وہ چار سال بعد بار آور ہوا۔ اٹھارہویں صدی کے اوائل میں آکسفورڈ اور کیمبرج میں پروفیسری کی دو نئی اسامیاں قائم کی گئیں اور اس طرح اب انگلستان کی ان دونوں یونیورسٹیوں کو عربی کی دو دو کرسیوں کی موجودگی پر فخر کرنے کا موقع حاصل ہو گیا۔ اس زمانہ کے نامور ماہرین علوم عربیہ کی تعداد اتنی زائد ہے کہ ہر ایک کا جدا جدا ذکر نہیں کیا جا سکتا۔ ہم صرف یہی کر سکتے ہیں کہ ہنٹ (Hunt)، وھائٹ (White)، ہائڈ (Hyde)، گیگنیئر (Gagnier)، براؤن (Brown)، والس (Wallis) اور فورڈ (Ford) جیسے اٹھارہویں صدی کے چند علماء کا ذکر کر دیں۔ یہ سب کے سب اپنے زمانے کے مشہور اساتذہ اور محققین شمار کیے جاتے تھے۔ اس سلسلہ میں چند علماء کے نام خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔ پریدو (Prideaux) نے جو ۱۶۴۸ء سے ۱۷۲۸ء تک زندہ رہا، سیرت محمد ﷺ پر ایک کتاب تالیف کی۔ چاپلو (Chappelow) نے جو ۱۶۸۳ء سے ۱۷۶۸ء تک زندہ رہا، عربی صرف و نحو کی ایک کتاب تالیف کی۔ لامیتہ العجم اور عربی ادب کی سب سے زیادہ دقیق کتاب "مقاماتِ حریری" کا انگریزی میں ترجمہ کیا۔ کارلائل (Carlyle) نے ایک بغدادی سیاح سے کیمبرج میں عربی پڑھی اور بہت سی عربی نظموں کا انگریزی میں ترجمہ کیا۔ انگلستان میں اٹھارہویں صدی کے ماہرین علومِ عربیہ میں سے چار علماء کی علمی خدمات خاص اہمیت رکھتی ہیں کیونکہ وہ انگریزی تمدن کے ترکہ کا وہ خاص حصہ ہے جس نے انگریزی ادیبوں کو عام طور پر بہت متاثر کیا۔

ان میں کا پہلا شخص سائمن اوکلے (Simon Oakley) تھا جو ۱۶۷۸ء سے ۱۷۲۰ء تک زندہ

رہا۔ اس نے کیمبرج اور آکسفورڈ دونوں جگہ عربی کی تعلیم حاصل کی اور نوجوانی ہی میں غیر معمولی ذہانت رکھنے والے طالب علم کی حیثیت سے مشہور ہو گیا تھا۔ یہ آکسفورڈ کے مشہور ماہرِ علومِ عربیہ ایڈورڈ پوکاک کا شاگرد تھا جس کا ذکر پچھلی تقریر میں کیا جا چکا ہے۔

اوکلے اپنی ایک کتاب کے دیباچہ میں نہایت عزت و احترام کے ساتھ اپنے اُستاد کا ذکر ان الفاظ میں کرتا ہے۔ "فاضل و محترم ڈاکٹر پوکاک جن کی ذاتِ گرامی اس عہد اور اس قوم کے لیے باعثِ فخر و زینت ہے اور جن کی یاد میرے لیے قابلِ احترام ہے۔" اوکلے جو بالآخر کیمبرج میں عربی کا پروفیسر ہو گیا تھا، علوم عربیہ سے والہانہ شغف رکھتا تھا بلکہ اس نے مادی چیزوں سے غفلت برتنے کی وجہ سے اپنے اور اپنے بہت سے بچوں کو سخت غربت میں مبتلا کر دیا تھا۔ بہت سے مصائب اور ذاتی مشکلات کے باوجود اوکلے نے اپنا کام جاری رکھا اور اپنی کوششوں میں کبھی کوتاہی نہیں کی۔ تحصیل السنہ مشرقیہ کے لیے ایک عام مقدمہ اور ابنِ طفیل کی کتاب حی بن یقظان کے انگریزی ترجمہ کے علاوہ اوکلے کا خاص کارنامہ اسلام کی سیاسی و تمدنی تاریخ ہے جو اُس نے تین جلدوں میں انگریزی زبان میں تالیف کی۔ اس کتاب کے ذریعہ پہلے پہل اس امر کی کوشش کی گئی کہ انگریزوں کو عام پسند اور عام فہم زبان میں عربی تہذیب کے کارناموں سے روشناس کیا جائے۔ اس سے پہلے زمانے میں جو چند خاص ماہرین علومِ عربیہ گزرے تھے، ان کی تالیفات سے صرف مخصوص ماہرین ہی واقف ہوتے تھے لیکن اوکلے نے پہلی بار علومِ مشرقیہ کے سلسلے میں اپنی تحقیقات کے ثمرات انگلستان کے پڑھے لکھے لوگوں کے زیادہ وسیع حلقے کے سامنے پیش کیے جسے اس طرح اسلامی دنیا کے شاندار کارناموں سے کچھ نہ کچھ واقفیت حاصل ہو گئی۔ گو اوکلے کی یہ تاریخ حال کی تحقیقات کے پیشِ نظر بعض حیثیتوں سے غلط اور فرسودہ ہے، تاہم اُسے اپنے زمانہ میں ایک قابلِ قدر کارنامہ شمار کیا جاتا تھا اور یورپ کے اہلِ علم اور مؤرخین جن میں انگلستان کا مؤرخ اعظم گبن (Gibbon) بھی شامل ہے جس کی تاریخ "سلطنت روما کا زوال و خاتمہ" (Decline and fall of the Roman Empire) عالمگیر شہرت حاصل کر چکی ہے، اسے قدر کی نگاہ سے دیکھتے تھے۔ اس تالیف کی وجہ سے مؤلف کو انگریزی ادب میں مرتبہ دوام حاصل ہو گیا۔

اس زمانے کی ایک اور بڑی شخصیت جارج سیل (George Sale) کی ہے جو ۱۶۹۷ء سے ۱۷۳۶ء تک زندہ رہا۔ اسلام سے اُسے اس قدر دلچسپی تھی کہ گبن نے جس کا ہم نے ابھی ذکر کیا ہے اُسے "نیم مسلم" بتایا ہے۔ گو یہ بیان شاید مبالغہ آمیز ہے، تاہم اس سے کسی حد تک یہ پتہ ضرور چلتا ہے کہ سیل کے بارے میں اُس کے معاصرین کی کیا رائے تھی۔ سیل کا پیشہ وکالت تھا۔ اُس نے فرصت کے اوقات میں عربی پڑھی اور عربی کتابوں کے قلمی نسخوں کا ایک بڑا ذخیرہ جمع کیا۔ اس کا خاص علمی کارنامہ جو اس کی سب سے بڑی یادگار ہے، قرآن پاک کا انگریزی ترجمہ ہے جو ۱۷۳۴ء میں شائع ہوا۔ یہ تمام یورپی زبانوں میں قرآن کا سب سے پہلا مکمل ترجمہ ہے۔ مسلمان اس کام کی عظمت کو اچھی

طرح سمجھ سکتے ہیں۔ اس سخت اور دشوار کام میں سیل کو اس حد تک کامیابی ہوئی کہ بہت سے ماہرین کا آج بھی یہ خیال ہے کہ قرآن کا اس سے بہتر ترجمہ موجود نہیں۔ یہ اب تک لاتعداد بار طبع ہو چکا ہے اور آج بھی کثرت سے مستعمل ہے۔ فرانسیسی، جرمن اور پولستانی زبانوں میں قرآن پاک کے جو ترجمے ہوئے وہ سیل ہی کے انگریزی ترجمہ پر مبنی ہیں۔

سیل نے محض ترجمہ ہی پر اکتفا نہیں کی حالانکہ صرف اس کام کے لیے بھی بڑی علمی قابلیت کی ضرورت تھی۔ اس نے انگریزوں کے استفادہ کے لیے اپنے ترجمہ کے ساتھ ساتھ مفصل حاشیے اور شرحیں اضافہ کر دیں تاکہ بعض مشکل عبارتیں اُن کی مدد سے صاف اور آسان ہو جائیں۔ اس ترجمہ کے ساتھ جو مفصل دیباچہ شامل ہے وہ اصل مذہب اسلام پر ایک مقالہ کی حیثیت رکھتا ہے۔

اٹھارہویں صدی کے ادیبوں نے سیل کے ترجمے سے بہت کام لیا ہے کیونکہ ان کے پاس اسلام کی اس مقدّس کتاب اور پیغمبر اسلام کے متعلق معلومات حاصل کرنے کا ایک یہی ذریعہ تھا۔ یورپ میں بھی اس کا بہت وسیع مطالعہ کیا گیا۔

والٹیر نے اپنی "لغت فلسفہ (Philosophic Dictionary) میں اس کا حوالہ دیا ہے۔

سیل کی دوسری تصنیفات کے سلسلے میں بیل (Bayle) کی انسائیکلوپیڈیا کا بھی ذکر کیا جا سکتا ہے جو دورِ جدید میں یورپ کی پہلی انسائیکلوپیڈیا خیال کی جاتی ہے اور جس کی تالیف میں سیل نے بھی ہاتھ بٹایا تھا۔ وہ تمام مضامین جو اس کتاب میں عربوں کے متعلق ہیں اُسی کے لکھے ہوئے ہیں۔

تیسرا اہل علم سر ولیم جونس (Sir William Jones) ہے جو ۱۷۴۶ء سے ۱۷۹۴ء تک زندہ رہا۔ جونس علوم عربیہ کے مقابلے میں ہندوستانی علوم کے ماہر کی حیثیت سے زیادہ مشہور ہے۔ اس میں شک نہیں کہ جہاں تک یورپ میں ہندوستانی علوم کی تحصیل کا تعلق ہے، اسے اوّلیت کا شرف حاصل ہے۔ جیسے جیسے یورپی ممالک کے قدم مشرق میں آگے بڑھتے گئے۔ انگلستان اور فرانس میں روز بروز ہندوستانی چیزوں سے دلچسپی بڑھتی گئی اور یک بہ یک علمی سرگرمیاں شروع ہو گئیں۔ ہندوستان اور انگلستان میں انگریز اہل علم نے سنسکرت کی پُرانی کتابوں کا مطالعہ کیا اور سنسکرت زبان کے قواعد مدوّن کیے۔ اسی طرح انھوں نے علوم مشرقیہ کی ایک جدید شاخ کی بنا ڈالی جس نے ایک صدی بعد جرمنی اور دوسرے مقامات میں بہت فروغ پایا۔ اگرچہ سر ولیم جونس کا خاص کام ہندوستان سے متعلق تھا، وہ علوم عربیہ میں خاص قابلیت رکھتا تھا بلکہ سنسکرت سے بہت پہلے اس نے عربی شروع کی تھی۔ شاید اس کا ہندوستان کا سفر بھی کسی حد تک اسی دلچسپی کی بنا پر تھا جو اسے عربی زبان اور اسلام سے تھی۔ اسے بچپن ہی میں عربی سے لگاؤ پیدا ہو گیا تھا اور وہ اپنے طور پر اسے سیکھتا رہا۔ اُس نے آکسفورڈ آ کر عربی اور فارسی کا گہرا مطالعہ کیا اور وہ ایک شامی مسلمان کو اپنی تعلیم کے لیے لایا۔ عربی زبان کے متعلق اُس کی خاص تالیف معلقات کا انگریزی میں کامل ترجمہ ہے جو زمانۂ جاہلیت کے سات مشہور عربی قصائد پر مشتمل ہے

۔اس طرح جونس نے انگلستان کے اہلِ علم کی بڑی خدمت انجام دی کہ انھیں قدیم عربی ادب کے ان جواہر ریزوں سے روشناس کیا۔ ہندوستان کے قیام کے زمانے میں یہی نہیں کہ اُسے شرعِ اسلامی پر متعدد کتابیں شائع کرنے کا موقع ملا بلکہ اُس نے ہندوستان کے متعلق بھی بہت سے تحقیقی رسالے شائع کیے۔

آخر میں ہم بہت اختصار کے ساتھ جے۔ ایل۔ برک ہارٹ (J. L. Burckhardt) کی زندگی پر نظر ڈالتے ہیں جو ۱۷۸۴ء سے ۱۸۱۷ء تک زندہ رہا۔ برک ہارٹ اصلاً سوئٹزرلینڈ کا باشندہ تھا۔ مگر اس نے انگلستان میں تعلیم پائی اور پھر یہیں سکونت اختیار کر لی۔ چند سال یورپ کی یونیورسٹیوں میں تعلیم حاصل کر کے وہ حلب گیا جہاں رہ کر اُس نے عربی زبان میں کافی ملکہ حاصل کر لیا۔ اُس نے اپنی زندگی کا بڑا حصہ شام، مصر اور عرب کی سیاحت میں گزارا۔ وہ محمد علی پاشا کی خاص حمایت میں مکہ مکرّمہ کی زیارت کا شرف حاصل کرنے میں کامیاب ہوا۔ اس کی خاص تالیفات وہ سفر نامے ہیں جو مشرقِ قریب میں اس کی سیاحت کے متعلق ہیں۔ اس کی کتاب "بدوی عرب اور وہابی" (Beduins And Wahabis) جو ذاتی تجربات پر مبنی ہے، اُس اہم ترین تحریک کا صحیح اور مفصل بیان ہے جو کچھ ہی پہلے اپنی طاقت و وسعت کے پہلے دور میں اوجِ کمال کو پہنچ چکی تھی۔ اس نے ان عربی ضرب الامثال کا ایک بڑا ذخیرہ مدوّن کیا جو اس نے اپنی سیاحت کے دوران میں جمع کی تھیں اور عربی متن کے ساتھ ساتھ ان کا انگریزی ترجمہ مع شرح کے شائع کیا۔ اس کی کتابیں دور دور پڑھی اور قدر کی نگاہ سے دیکھی جاتی تھیں۔ ان کتابوں کا ترجمہ انگریزی سے یورپ کی بہت سی زبانوں میں ہوا۔ ۱۸۱۷ء میں مصر میں اس کا انتقال ہو گیا۔

اٹھارہویں صدی کا آخری حصہ وہ دور ہے جس میں مشرقی تہذیب کے متعلق مغرب میں بہت دلچسپی پائی جاتی تھی۔ ایشیا میں روز بروز یورپی اثر کے بڑھنے اور ان ترجموں کی وجہ سے جو ان علماء کے علاوہ جن کا ہم نے ذکر کیا ہے، بہت سے دوسرے علماء نے عربی اور فارسی زبانوں سے کیے۔ انگلستان کے اکثر ادیب عربی ادبیات سے واقف ہو گئے۔ الف لیلیٰ کے اس ترجمہ کا بھی کافی اثر پڑا جو یورپی زبان میں پہلے پہل ہوا اور اس صدی کے آغاز میں شائع ہوا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ یورپی ادب میں مستشرقیت (Orientalism) کی ایک لہر دوڑ گئی۔ انگریز شاعر اور مصنفین نے عربی و فارسی ماخذوں کو پیشِ نظر رکھ کر مشرقی موضوع پر قصے کہانیاں تیار کرنی شروع کر دیں۔ یہ تحریک انگلستان کے علاوہ یورپ کے دوسرے ممالک میں بھی پھیل گئی اور وہاں اس کی وجہ سے رومانیت کا احیاء (Romantic Revival) عمل میں آیا۔ جرمن شاعرِ اعظم گیٹے (Goethe) مشرقی کتابوں کے انگریزی اور فرانسیسی ترجموں سے بہت متأثر ہوا۔

اٹھارہویں صدی کے آخر میں فرانسیسیوں نے نپولین کی سرکردگی میں مصر پر حملہ کیا تھا اور اس طرح عربی تمدن رکھنے والے ایک ملک سے اُن کا براہ راست تعلق ہو گیا۔ اس کے علاوہ تحصیل علوم عربی کی تحریک میں اس وجہ سے بھی نیا زور پیدا ہو گیا کہ چند سال بعد محمد علی پاشا کی قیادت میں مصر ایک طاقتور اور عملاً مستقل حکومت کی حیثیت سے نمودار ہوا اور یورپی سیاسیات میں اہم حصہ لینے لگا۔ اس طرح ہم انیسویں صدی میں پہنچ جاتے ہیں جو ہماری آئندہ تقریر کا موضوع ہو گا۔